آوارگی میں جن زمانوں کی سیر میں نے کی اُن زمانوں کے سفرناموں میں جتنے بھی واقعات درج ہیں ان میں صرف محمد علی ڈاکیے سے ملاقات کا حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں مجھے اب بھی گمان گزرتا ہے کہ یہ میرا واہمہ تھا.. میں جو کوہ نوردی کے لیے نکلتے ہی ڈان کے خوتے کی مانند فاتر العقل ہو جاتا ہوں.. پن چکیوں کو عفریت سمجھ کر اپنے مریل گھوڑے روزی نانتے پر سوار نیزہ تانے اُن پر حملہ آور ہوتا ہوں.. کسی گھاٹی میں چلتے بھیڑوں کے ریوڑ سے اُٹھنے والی دُھول کو دیکھ کر چوکنا ہو جاتا ہوں کہ یہ تو دشمن کی فوج ہے جو میری جانب آ رہی ہے اور میں ایک بہادر نائٹ کی طرح زنگ آلود زرّہ بکتر پر ہاتھ رکھے اُس پر بھی حملہ کر دیتا ہوں... تو جیسے نہ وہاں دیو تھے اور نہ عفریت اور نہ دشمن کی فوج بلکہ صرف فاتر العقلی تھی تو ایسے ہی نہ وہاں کوئی بدخشانی گھوڑا تھا اور نہ ڈاکیا محمد علی.. صرف ایک واہمہ تھا.. لیکن میرے کیمرے میں سے نکلی ہوئی ایک تصویر ہے جو گواہی دیتی ہے کہ یہ ایک حقیقت تھی.. ایک تصویر سے تو جرح نہیں ہو سکتی..

پچھلے پندرہ برسوں کی حیات میں کوئی ایک بیکار اُکتا دینے والا تاریک دن نہ تھا اور کوئی ایک نیند کے راستے روکتی رات نہ تھی جس میں میں نے متعدد بار.. ایک تواتر ایک تسلسل سے اپنے آپ سے یہ سوال نہ کیا ہو کہ اگر ڈاکیا محمد علی اپنے چرمی تھیلے میں سے کوئی خط نکال کر کہتا کہ ہاں صاحب.. یہ آپ کے نام آیا ہے.. تو وہ خط کس کا ہوتا؟

یہ غیب سے کس کے علم میں آ گیا تھا کہ میں فلاں وادی میں سے ایک معین زمانے میں گزروں گا... یہ پتہ کس کو تھا اور کس نے لکھا..

میں بے نیند ہوا.. ڈیپریشن میں چلا گیا.. تمام امکانات پر غور کیا لیکن پھر بھی آج تک کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا... اور یہ میرے لیے ایک مسلسل اذیت کا باعث ہے اور میں بہرصورت اس

اذیّت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں..

میرے لیے ان بھول بھلیوں میں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ میں اُن امکانات کے بارے میں ایک ''ناول'' لکھوں۔ کسی بھی منصوبہ بندی کے بغیر ایک مروّجہ ناول کی اونچ نیچ..کلائمکس کا حساب کتاب کیے بغیر..کرداروں کے تسلسل اور واقعات کی ترتیب کے بغیر..اس اذیّت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک ''ناول'' لکھوں..مختصر یہ کہ دوات میں سے اپنا قلم بھر کر اپنے سامنے ایک کورا کاغذ رکھ لوں..اور لکھنا شروع کر دوں..اپنے آپ کو اُن حرفوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں جو بے ترتیب میرے ذہن میں آتے چلے جاتے ہیں..تو شاید اس طور میرے مسئلے کا کوئی حل نکل آئے..

تو میں نے ایسا ہی کیا ہے..

میں نے قطعی طور پر نہیں سوچا..کوئی منصوبہ بندی نہیں کی کہ اب میرے سامنے جو کورا کاغذ پڑا ہے اس پر کیا لکھوں گا..اور جو کچھ لکھوں گا اُس میں کوئی Sense بھی ہوگی یا نہیں..کیونکہ اس تحریر میں مَیں شامل نہیں ہوں..یہ کورے کاغذ اور قلم کے درمیان معاملہ ہے..

ایک ناول کا پہلا فقرہ لکھنا سب سے مشکل ہوتا ہے..

کہاں سے آغاز کیا جائے..دل کو گرفت میں..یکلخت گرفت میں لے لینے والے ایک مکالمے سے..ایک حیران کن منظر کے بیان سے..کسی حادثے سے..یا اُس کے انجام کو ظاہر کر کے..پھر سے آغاز کر کے انجام تک پہنچا جائے..

ایک ناول کا پہلا فقرہ لکھنا ایک عذاب اس لیے ہوتا ہے کہ اُس فقرے میں ناول کی ناکامی یا کامیابی کا بیج بویا جاتا ہے..

اور ایک ایسے ناول کا..جو ناول نہ ہو..اُس کا پہلا فقرہ لکھنا ایک کڑا امتحان ہے جس کی کامیابی کی اُمید موہوم ہوتی ہے..

اور ایک ناول..جو ناول ہی نہ ہو..اُلجھے ہوئے رنگ رنگ کے کچے دھاگے ہوں جو ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہوں اُنہیں کیسے ایک مترنّک کھڈی پر چڑھا کر ایسا کھیس بُنا جائے جس پر کوئی واضح ڈیزائن نمایاں ہو..ترتیب ہو خوش نمائی ہو..ایسی جسے لوگ قبول کر لیں..جس ترتیب اور خوشنمائی کی لوگوں کو عادت ہو..

مستعمل طریقہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ اِن دھاگوں کو..جو حیات کے شب و روز کے تانے

بانے میں اُلجھ گئے ہوں.. پہلے سلجھایا جائے..ایک ایک دھاگے کو اس کے رنگ کی مناسبت سے الگ کیا جائے اور پھر انہیں کھڈّی پر چڑھایا جائے..اور پھر وہ کھیس بُنا جائے جس میں ترتیب اور خوشنمائی ہو..اور دیکھنے والے عش عش کر اُٹھیں..

لیکن دھاگے اس حد تک اُلجھے ہوئے ہیں کہ کھینچا تانی میں وہ ٹوٹ تو سکتے ہیں..جدا جدا نہیں ہو سکتے..

ویسے بھی سُلجھے ہوئے دھاگوں سے ایک کھیس بُن لینا ایک روٹین ہے..ایسا تو کوئی بھی کُند ذہن جولاہا کر سکتا ہے..زندگی بھر کی بُنت کے تجربے کو بروئے کار لا کر کر سکتا ہے..بلکہ آنکھیں بند کر کے کر سکتا ہے..اور ایسے دھاگوں کو کھڈّی میں چڑھانا جن کا سرا نہ ملتا ہو..اُن میں گانٹھیں پڑی ہوں..کہیں ٹوٹتے ہوں کہیں گم ہوتے ہوں..اور ہر دھاگے کا رنگ جدا ہو تو اُن سے ایک ناول کا کھیس کیسے بُنا جائے...

ایک سلجھاؤ والے تانے پیٹے سے تو ہر کوئی ایک کھیس بُن سکتا ہے..

تو ایک اُلجھاؤ والے تانے پیٹے سے بے شک کھیس کی بناوٹ اور ڈیزائن بھدّے اور بے سُرے ہو جائیں..بے ڈھب اور بے ترتیب ہو جائیں..کھیس تو بُننا ہے..یہ جاننے کی سعی تو کرنی ہے کہ وہ خط کس کا ہو سکتا تھا..محمد علی ڈاکیے کے پوسٹ ماسٹر نے یہ لکھ دیا تھا کہ مجھے انہی اُلجھے ہوئے دھاگوں سے یہ کھیس تیار کرنا ہے..اور اُس نے جو لکھ دیا سو لکھ دیا..میرا اس لکھے پر کیا اختیار..مجھے وہی کرنا ہے جو اُس نے لکھ دیا..میں چاہوں یا نہ چاہوں!

اور یہ اُلجھے ہوئے دھاگے جو سب کے سب حیات کی گٹھڑی کھولنے پر نظر کے سامنے آتے ہیں..سب کے سب میرے اپنے نہیں ہیں..بہت سے لوگوں کی حیات کی گٹھڑیاں میں نے چوری چھپے کھول لی ہیں..چنانچہ اس ناول کے کھیس میں جو تانے بانے ہیں اُن میں آپ سب کے اُلجھاؤ بھی شامل ہیں..

اس میں اُس ہاتھ کا اُلجھاؤ بھی شریک ہے جس نے کپاس کے پھول کو کُھردرے پتّوں کے بیچ میں سے طلوع ہونے والے اس سفید سورج کو اپنی اُنگلیوں کی گرفت میں لے کر ٹینڈے سے الگ کیا تھا..

اور کپاس کے پھول کو چُننے کا لمحہ وہ ہوتا ہے جب اُس میں اوس کی ہلکی سی تراوٹ باقی ہو..وہ دھوپ سے اتنا خشک نہ ہو جائے کہ اُس کے روئیں الگ ہونے لگیں..پھر اُس پھول کی

برف سفیدی میں شامل..اُس میں گندھے ہوئے بنولے چن کر الگ کیے جاتے ہیں..اس میں جو پتے اور ٹہنیاں رہ جاتی ہیں وہ الگ کی جاتی ہیں..پھر وہ کپاس پاکیزہ اور سفید کنواری کا رُوپ دھارتی ہے اور اُسے سنوار سنوار کر ایک پُونی کی شکل دی جاتی ہے..اور تب جا کر وہ اس لائق ہوتی ہے کہ اُس کے اور چرخے کے تکلے کے درمیان ایک نازک ذرا سی بے احتیاطی سے ٹوٹ جانے والا رشتہ قائم ہو۔

گھوم چرکھڑے گھوم..تیری کتّن والی جیوے..

کپاس کی پُونی میں سے پہلی تند نکالنا..اُس کی گھنی سفیدی میں سے ایک دھاگے کا سرا تخلیق کرنا ایک معجزے سے کم نہیں۔

چرخہ گھوکتا اور گھومتا ہے اور اُس نفاست یا بے ڈھب انداز میں گھومتا ہے جو اُس کی ہتّھی گھمانے والے ہاتھ میں ہوتی ہے..

نوکیلے گھومتے تکلے کی قربت میں پُونی پہنچتی ہے تو اُس کی گھماوٹ اُس کے اندر سے ایک دھاگہ کھینچتی ہے جو اُس کے ساتھ لپٹتا جاتا ہے..اور جونہی یہ رشتہ قائم ہوتا ہے پونی والا ہاتھ دھیرے دھیرے بلند ہونے لگتا ہے اور کپاس کے ریشے اُس کے ساتھ گھومتے ایک شکل اختیار کرتے..ایک دھاگے میں بدلتے تکلے کے ننگے بدن کو اپنی سفیدی سے ڈھانپتے چلے جاتے ہیں..

پُونی اپنا وجود کھونے لگتی ہے..اپنے آپ کو ادھیڑتی ہوئی تکلے پر اٹّی کی صورت ایک نیا جنم لینے لگتی ہے..

ہم اس اٹّی کو حقیر نہیں جان سکتے کہ اس میں ایک پیغمبر کو خرید لینے کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔

ترنجن کی رات ہو تو چنگیریں اٹّیوں سے لبریز ہو جاتی ہیں..

کر کتّن وَل دھیان کڑے..

جو کُڑیاں کتّن وَل دھیان کرتی ہیں صرف اُنہی کی چنگیریں اٹّیوں سے بھرتی ہیں لیکن..جو دھیان نہیں کرتیں ان کے چرخے کی ہتّھی ڈھلک جاتی ہے اور ان سے کاتا نہیں جا سکتا..ان کے تکلے کو بل پڑ پڑ جاتے ہیں اور وہ اسے درست کرنے کے لیے لوہار کو صدا نہیں دے سکتیں..اُن کی تندی ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے..تکلا جھولتا ہے اور گھڑی گھڑی جھولتا ہے اور ایک بھی چھلّی..ایک بھی اٹّی تیار نہیں کر پاتا..

میں بھی دھیان تو کرتا ہوں لیکن میری تحریر کی ہتھنی ڈھلک ڈھلک جاتی ہے.. تکلا جھول جھول جاتا ہے اور تند ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے..

پھر ان انٹیوں سے تانا بیٹا لگتا ہے.. مسلسل دھاگے بنتے ہیں.. رنگے جاتے ہیں اور تب جا کر وہ جولاہے کی کھڈی میں سجتے ہیں..

اور پھر ایک کھیس وجود میں آتا ہے..

یہ ناول... جو شاید ناول نہیں ہے.. محض کپاس کے ایک پھول اور اُس کے ایک کھیس کی شکل میں نمودار ہونے کا قصہ ہے..

لیکن اس نہایت اُلجھے ہوئے قصے میں ایک اور اُلجھاؤ ہے.. کپاس چننے والے ہاتھ اناڑی تھے.. انہوں نے پھول کو اُس کے مسکن سے مشاقی سے الگ نہیں کیا اور یوں کچھ ریشے ٹینڈے میں ہی رہ گئے.. پھر اُس کپاس کو صاف کرنے والے ہاتھ بھی نادان اور ناتجربہ کار تھے.. کہ اُس میں چند ایک بنولے اور سوکھے ہوئے پتے بھی رہ گئے..

ایک اور المیہ یہ ہوا کہ جن ہاتھوں نے پُونیاں مروڑیں وہ بھی اس فن سے ناواقف تھے..

اور بالآخر جو چرخہ کاتنے والی تھی وہ بھی گنوار تھی اور اُس کا دھیان کہیں اور تھا اور ہتھنی اس کے قابو میں نہ آتی تھی اور تند ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی.. اس کے بعد تانا بیٹا لگانے والے اناڑی جولاہوں کو کیا دوش دینا.. چنانچہ میرے نصیب میں جو بھی دھاگا آیا.. اُلجھا ہوا ہی آیا۔

ان اُلجھے ہوئے دھاگوں کو اپنی کھڈی پر چڑھا لینا اور ایک کھیس بُننے کی سعی کرنا میری مجبوری ہے۔

اس کا تذکرہ کیا کرنا کہ میں نے اب تک ہمیشہ سلجھے ہوئے دھاگوں سے ہی کھیس بُنے ہیں.. اُن کے ڈیزائن اور رنگوں کے انتخاب کا ایسا دھیان رکھا ہے کہ سب نے اُنہیں اپنی رُوح کے نہاں خانوں میں سجایا ہے اور میری بُنت اور کاریگری کی داد دی ہے..

اس بار بھی میرا ارادہ تو یہی تھا.. لیکن..

سامنے سے اپنے بدخشانی گھوڑے کی تھرکتی پیٹھ تھپکتا محمد علی ڈاکیا آ گیا.. اُس نے اُن سارے دھاگوں کو جو میں آج تک ترتیب اور تناسب کی کھڈی پر بُنتا آیا تھا اُلجھا کر رکھ دیا.. تو اس میں میرا تو کوئی دوش نہیں..

تو میں وہ جولاہا ہو گیا ہوں جس کی ڈور کوئی اور کھینچتا ہے.. اُلجھے ہوئے حیات کے

دھاگوں کو اپنی کھڈی پر چڑھاتا ہوں..

ایک تاریک..قبر نما کچی کوٹھڑی میں نصب اپنی کھڈی کے آگے جو گڑھا ہے اُس میں ٹانگیں اُتارے بیٹھا ہوں..

ایسے بیٹھتا ہوں کہ میرے پاؤں اس گڑھے کی کچی تہہ پر جا رُکتے ہیں...آس پاس اگر دن ہے تو یہاں نیم تاریکی ہے..میں کھڈی کی پنڈلی پر اپنا پاؤں رکھ کر دباتا ہوں اور پھر تانے پیٹے کے بیچ میں سے سُوت کی چھلّی کو بائیں ہاتھ میں پکڑ کر تانے کے نیچے سے دھکیلتا ہوں اور پھر دائیں ہاتھ سے اُسے وصول کر کے پھر سے واپس کرتا ہوں تو پیٹے کے اندر ہی اندر سُوت کے دھاگے ایک کھیس کی شکل اختیار کرتے جاتے ہیں..

چونکہ میرے دھاگے سب کے سب اُلجھے ہوئے ہیں اس لیے میں روٹین کے مطابق یہ عمل نہیں کر سکتا..مجھے سوچنا پڑتا ہے کہ میں سُوت کی چھلّی کو دائیں ہاتھ پر دھکیلوں یا بائیں ہاتھ پر..

یوں کہ اُلجھے ہوئے حیاتی دھاگوں سے..گانٹھوں سے بھرے سُوت میں سے ایک کھیس وجود میں آ جائے..

میں ایک ایسا جولاہا ہوں جو لمحۂ موجود تک صدیوں سے چلی آنے والی روایت کے تابع سیدھے سادے..ترتیب والے..مخصوص نمونوں اور رنگوں کے کھیس بُننے والا تھا اور اب مخمصے میں پڑ گیا ہوں..میں نے اگر یہ اُلجھے ہوئے دھاگوں والا..پھول کہاں آئے گا..پتہ کہاں نمودار ہو گا یہ جانے بغیر ایک بنا ترتیب کھیس بُن بھی لیا تو اسے خریدے گا کون..کون ہیرا سے اپنے رانگلے پلنگ پر بچھانے کا خطرہ مول لے گی..

چوہدرانیاں جو میرے ہاتھ کے بُنے ہوئے کھیسوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتی تھیں اور اپنی بیٹیوں کے داج سجاتی تھیں اسے دیکھ کر مجھ سے بدظن ہو جائیں گی..ناک چڑھا کر کہیں گی جولاہا سٹھیا گیا ہے حواس کھو بیٹھا ہے..اور چوہدری جو میرے خوش رنگ کھیسوں کو پالے کے دنوں میں اوڑھتے تھے..اس کھیس کو دیکھ کر مجھ کمی کمین کو اگلے برس نہ گندم دیں گے اور نہ گُڑ اور نہ مجھے اپنے کھیتوں میں سے بھینس کے لیے چارہ کاٹنے دیں گے..

اس کے باوجود یہ کھیس بُننا..یہ ناول لکھنا میری مجبوری ہے..

مجھے مجبور کس نے کیا؟..محمد علی ڈاکیے نے..

اور محمد علی ڈاکیے کو ایک بدخشانی گھوڑے پر بٹھا کر اُس لمحے میری طرف کس نے روانہ کیا؟

اُس نے!

جس کے پاس فنا اور بقا کا ڈاک گھر ہے..جو پوسٹ ماسٹر ہے..

اُس نے کُن کہا ہوگا تو یہ ڈاکیا وجود میں آیا..

اور اگر اُس کے پاس ایک خط میرے نام کا ہے تو اُس نے میرے اندر جستجو کا زہر بھرا کہ میں یہ جاننے کی سعی کروں کہ وہ خط کس کا ہوسکتا ہے..

تو میری کیا مجال کہ میں زوگردانی کرسکوں..محض اس لیے یہ کھیس بُننے سے انکاری ہوجاؤں کہ دھاگے اُلجھے ہوئے ہیں اور کوئی ہیرا سے اپنے رانگلے پلنگ پر بچھانے سے انکاری ہوجائے گی..اور چوہدری میرا حقہ پانی..دانہ پانی بند کردیں گے اور میں بھوکا مرجاؤں گا..

تو میں اپنی نیم تاریک کچی کوٹھڑی میں اسیر انہی اُلجھے ہوئے دھاگوں سے ایک ناول...جو شاید ناول نہیں ہے..ایک کھیس...جو کھیس نہیں ہے..بُننے کی ابتدا کرتا ہوں..

کیا آپ کو کھٹ کھٹ کی آواز آئی؟

یہی تو میری کھڈی کی آواز ہے..جو میری اس نیم تاریک کوٹھڑی سے نکل کر..جہاں میں ایک گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوں..آپ کے کانوں پر کھٹ کھٹ دستک دیتی ہے کہ...یہ کھیس جو بُنا جارہا ہے صرف میرا نہیں آپ کا بھی ہے..

اس میں بُنے جانے والے دھاگوں میں سے صرف ایک دھاگا میرا ہے باقی سب آپ کی حیات سے مستعار لیے گئے ہیں..

میں سر جھکائے سُوت کی اٹّی والی کشتی کو نال کو دائیں ہاتھ سے دھاگوں کے درمیان میں سے تیراتا گزارتا ہوں اور اُس میں سے نکلنے والے دھاگے کو کھٹ سے کھیس کی بُنت کا ایک حصہ بناتا ہوں..کھٹ!..اور پھر بائیں ہاتھ میں وہ کشتی وصول کرکے اُسے واپس بھیجتا ہوں..ایک اور کھٹ!

کھٹ کھٹ..

لیکن ٹھہریئے میں اُس منظر کو اب قدرے تفصیل سے زندہ کرنا چاہتا ہوں جس کی پاداش میں مجھے یہ کھیس بُننا پڑ رہا ہے..

پہلے تو میں سرسری گزر رہا تھا..لیکن اب اُس کی جزئیات کو بیان کرنا بے حد ضروری ہے..

چنانچہ میں اپنی نیم تاریک کوٹھڑی میں ایک گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے اپنی کھڈی کے سامنے بیٹھا اُس منظر کو دوبارہ بیان کرتا ہوں... سفرنامے کے طور پر نہیں کہ جو کچھ گزرا تھا اسے دوبارہ بیان کردوں کہ وہ تو بیان ہو چکا.. بلکہ ایک ناول کے طور پر کہ جس میں متخیلہ کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے.. جیسے ایک اڑیل گھوڑے کی باگیں کھلی چھوڑ دی جاتی ہیں تا کہ وہ جہاں جی چاہے جائے.. عرش کا مسافر ہو جائے یا کسی کھائی میں جا گرے.. تخیل اور گھوڑے کو ایسے کُھلا چھوڑ دیا جاتا ہے..

وادیٔ شگر سے آگے..وہاں کی خانقاہِ معلےٰ کے صحن میں جو سینکڑوں برس قدیم بلند چنار ہیں اور جن کے تنوں میں اب تک ایک آگ سلگتی ہے اُن سے کہیں آگے..دریائے باشو کے کنارے جو ابھی کچھ دیر پہلے دریائے برالڈو تھا اُس کے کنارے..عین کنارے..پانیوں کے پاس نہیں بلکہ اُن سے بلند ہوتی گھنے سبزے والی ڈھلوانوں کے بیچ جو ایک کچی جیپ روڈ تھی اُس کے کنارے..

ایک تنہا درخت تھا..

یہ ممکن نہ تھا کہ وہاں صرف ایک درخت ہو اور آس پاس کچھ نہ ہو..کوئی اور شجر تک نہ ہو..لیکن ایسا ہی تھا..جیسے اُس کے آس پاس کسی اور درخت کو سر اُٹھانے کی اجازت ہی نہ تھی تا کہ اُس کی تنہا یکتائی میں خلل نہ پڑے..جیپ روڈ کے کنارے کھیتوں کی ہریاول میں کھڑا ایک گمشدہ تنہا درخت تھا جو زرد پھولوں سے بھرا..کہ دور سے وہ پھول ہی لگتے تھے..ایسے کہ ان کے بیچ کسی ایک پتے کی ہریاول بھی اُس زردانبار میں سے نہ جھلکتی تھی..

نزدیک ہوئے تو یہ کھلا کہ یہ پھول نہ تھے..رس بھری خوبانیاں تھیں جن کے زرد سورج اتنی کثرت میں اُس شجر پر طلوع ہوئے تھے کہ دور سے پھول ہی دکھائی پڑتے تھے..

یہ درخت..خوبانیوں سے ایسے بھرا ہوا تھا جیسے ایک حاملہ عورت کا پیٹ..اور کسی عام سی عورت کا نہیں بلکہ ایک ایسی عورت جس کی چاہت کا ثمر بہت برسوں بعد اُس کے اندر ٹھہرا ہو..اور جیسے اُس کے اندر اُس ثمر کے سوا کوئی اور گنجائش باقی نہیں رہتی ایسے وہ درخت تھا..خوبانیوں سے بھرا ہوا..

ہم اُس کے زرد سحر میں گرفتار رُک گئے..

وہاں تو ہزاروں سورج طلوع ہو رہے تھے..اور صرف ایک سورج طلوع ہونے سے ہم جیسے برگشتہ لوگ ایمان لے آتے تھے..

ہم جب رُکے اور اُس درخت کو جھنجھوڑ کر..اُس کے شانوں کو جھٹکے دے کر اپنی اپنی جھولیاں خوبانیوں سے بھر چکے..اپنے تیئں اُسے خالی کر چکے اور جب چلے اور پیچھے مڑ کر اُسے دیکھا اور اس شرمندگی سے دیکھا کہ ہماری لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں وہ برہنہ اور خالی ہو چکا ہوگا..جیسے پیدا ہونے کے بعد پیٹ خالی ہو جاتا ہے..تو وہ ایسا نہ تھا..وہ بدستور بھرا ہوا تھا ایسے..جیسے اُس کی شاخوں سے ایک بھی خوبانی جُدا نہ ہوئی ہو..

وہ اُسی طور زرد سورجوں کا انبار تھا جس پر نظر ٹھہرتی نہ تھی..

پھر حشوپی کے سیبوں کے باغ آئے جن کی ٹہنیاں درختوں تلے جو گھاس تھی اور برفانی نالیاں بہتی تھیں اُن پر جھکی ہوئی اُنہیں چھوتی تھیں..

ان سے پرے وہ نالے آئے..پُرشور اور پُروحشت جن میں سے ہماری جیپیں رُکتی..اٹکتی..ہمیں جھٹکتیں..پتھروں سے ٹکراتیں پار ہوئیں..

سوہنی کی مانند ہمارے گھڑے کچے نہ تھے..لوہے کے بنے ہوئے تھے..وہ پانیوں میں گھلے نہیں..ہمیں ان کے پار لے گئے..

اور جب ہم پار اُترے ہیں..تو وہ آ رہا تھا..

سامنے سے وہ آ رہا تھا..

اس خوبانیوں کی زردی سے حاملہ تنہا درخت سے آگے..حشوپی کے سیبوں کے باغوں سے بھی کہیں آگے..دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی شاہ گوری کے راستے پر..دریا کے چوڑے پاٹ کے کناروں سے جو ڈھلانیں اُٹھتی ہیں سبزے کے گھنے سمندر آنکھوں میں اُتارتی ہوئی..اُن کے برابر میں ایک کچے راستے پر ایک لشکتی اور تھرتھراتی جِلد والے بھورے رنگ کے پُرتمکنت بدخشانی گھوڑے پر سوار وہ ہماری جانب آ رہا تھا..

لیکن نہیں..

وہ صرف میری جانب آ رہا تھا..بہت بعد میں جب کوہ نوردی کے قصے بیان کرتے ہوئے اُن کی یادیں تازہ کرتے ہوئے میں نے اُس کی نموداری کا تذکرہ کیا تو میرے ساتھی لاعلم تھے..انہوں نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا..اس ذکر کو جھٹلایا نہیں کہ وہ میری تعظیم کرتے تھے

اور اسے میری عمر رسیدگی کا ایک خیالی مظہر جانا لیکن مجھے شک کی نظروں سے دیکھا..اسے میرا ایک اور واہمہ جانا کہ..انہوں نے ایسا کوئی گھڑ سوار نہ دیکھا تھا..

اسی لیے وہ صرف میری جانب آ رہا تھا..

ایک شاندار گھوڑے کی تمکنت اُس کے سوار کی کمر کو سیدھا کر کے اُسے بھی پُرتمکنت کرتی ہے..

یہ گھوڑا ایسا تھا کہ اس کے لیے ایک سلطنت بھی قربان کی جا سکتی تھی..ایک گھوڑا..ایک گھوڑا..میری پوری سلطنت کے عوض میں..یہ ایسا گھوڑا تھا..پس منظر..ایک ایسا پس منظر جس میں آسمان کے وصل کی چاہت میں اُبھرتے برفوں سے بھرے پہاڑ ہوں..ٹھٹھری سرد یلی ہوا میں نکھرتا..ایسا پس منظر کسی بھی انسان کو تو کیا ایک جانور کو بھی بادشاہ بنا دیتا ہے..لیکن یہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ ایک جانور اپنے پس منظر کو پُرجلال اور پُرشکوہ بنا رہا تھا..وہ بنجر زمینوں پر بھی اپنے سُم رکھتا تو کونپلیں پھوٹنے لگتیں..ویرانوں میں قدم رکھتا تو چپکے سے بہار آ جاتی..یہ ایک ایسا گھوڑا تھا..

وہ ایک خاص نخرے سے چلتا آتا تھا..

جیسے اُس کے پاؤں میں جھانجریں ہوں..

اور وہ احتیاط کرتا ہو کہ جھانجھروں کی چھن چھن کہیں بلندیوں پر صدیوں سے ٹھہری برف کو بے آرام نہ کر دے..

اُس کی بھوری پسینے کی تمازت اور گیلاہٹ سے لشکتی جِلد..جیسے وصالِ یار میں ہو..جس کا بدن..یار کا بدن مہکتا اور پسینے سے لشکتا ہو..ایک ایسی جِلد جو اُس برفانی پس منظر میں بے قابو اور وصال پر آمادہ نظر آتی تھی..

اور اس کی ٹانگیں ایک خاص ربط سے اُٹھتی تھیں..اگرچہ نخریلے انداز میں لیکن ایسی اپنی وحشت کی باگیں کھینچتی ہوئی احتیاط کے ساتھ کہ اُس کے سُموں سے دُھول نہ اٹھتی تھی..کہ اس کے پاؤں میں جھانجھریں تھیں..

وہ ایسا گھوڑا تھا کہ نہ صرف اپنے پس منظر کو بلکہ اپنے سوار کو بھی معدوم کر دیتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ ایک کورا کاغذ ہے جس پر کسی چینی مصور نے بُرش کے چند ایک سٹروکس لگا کر گھوڑے کا بدن بنایا ہے اور وہ متحرک ہو کر چلا آ رہا ہے..ایک خلاء میں چلا آ رہا ہے..

وہ میرے قریب ہوا تو میں اُس سے مخاطب ہونے کو تھا کہ اس کی پشت پر ٹانگیں لپیٹے

ایک سوار نظر آ گیا تو میں نے اس سوار سے سوال کیا ''آپ کون ہیں؟''

سوار متعجب ہوا ''میں؟..آپ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں..''

گھوڑا لاتعلق کھڑا رہا..صرف ایک بار ہنہنایا اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لیے کہ تم دیکھتے تو مجھے تھے میری غیر مرئی جھانجھروں کی چھن چھن بھی سنتے تھے اور میرے لیے ایک سلطنت بھی قربان کر دینے کو جائز سمجھتے تھے اور اب مجھ سے نہیں میرے سوار کے ساتھ کلام کرتے ہو..

''نہیں..'' میں نے کہا ''میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو..مجھے علم نہیں..''

''صاحب..اگر لاعلمی ہو..بے خبری ہو..تو میدانوں کو چھوڑ کر ان بلندیوں پر نہیں آیا کرتے..یہاں ہوا میں آکسیجن کم ہوتی ہے..تو دماغ میں فتور بھر جاتا ہے..وہ کچھ دکھائی دینے لگتا ہے جو ہوتا نہیں..''

''تم ہو؟''

''ہاں میں تو ازل سے ہوں..''

''تو پھر میں تم سے نہیں پوچھتا کہ تم کون ہو..تم اپنا راستہ لو میں اپنے راستے پر جاتا ہوں..آگے چلا جاتا ہوں۔''

''آپ تو آگے نہیں جا سکتے''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ نصیب کی قید میں ہیں..اور نصیب کی تختی پر کچھ پُورنے ہیں..ایک خطاطوں کے خطاط نے اس تختی پر اپنی ازل کلک سے مدھم سیاہی میں کچھ حرف اُلیک دیئے ہیں..اور آپ نے صرف ان مدھم لفظوں پر قلم چلا کر انہیں واضح اور اجاگر کرنا ہے..آپ نے اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں لکھنا..آپ نے وہی لکھنا ہے جو لکھا جا چکا ہے..تو آپ نے ناحق خودمختاری کی تہمت اپنے سر لے لی..بدنام ہو جائیں گے۔اس لیے آپ نے اسی عبارت پر قلم چلانا ہے جو لکھی جا چکی ہے۔آپ کے بس میں کچھ بھی نہیں..''

''یعنی تم نے ایک بدخشانی گھوڑے پر سوار..بہرطور اس متعینہ لمحۂ موجود میں میرے سامنے نمودار ہونا تھا اور مجھے بھی تم سے یہی سوال پوچھنا تھا کہ تم کون ہو..اور اس میں میری منشا کو کوئی دخل نہ تھا؟''

''نہیں...آپ کے نصیب کی تختی پر یہ سب کچھ پہلے سے لکھا جا چکا تھا..''

وہ درست کہتا تھا..

ایک تختی تھی.. میرے دور افتادہ اور اب تو یکسر گمشدہ بچپن میں ایک تختی تھی.. سکول جاتے ہوئے.. جماعت سوم کے بلند تعلیمی درجے پر فائز میں جب ایک کھڑکھڑاتی دھوبی کی دھلی ہوئی کلف سے اکڑی ہوئی شلوار کے پائینچوں کو کیچڑ سے بچاتا جب اس تختی کو صبح سویرے.. کسی دھندلی صبح کے سویرے میں.. اس تختی کو اوس بھرے کھیتوں پر مارتے ہوئے چلتا جاتا تھا تو پچھلے روز کی لکھائی کی روشنائی اوس کی گیلاہٹ سے پھیلنے لگتی تھی.. اس پر لکھے ہوئے حرفوں کی رالیں بہنے لگتی تھیں اور وہ اپنی پہچان کھونے لگتے تھے.. اور یہ بھی روٹین تھی کہ میں اس تختی کو ایک جوہڑ میں دھوتا تھا دیگر تمام بچوں کی مانند اور جونہی تختی کو پانی میں ڈبوتا تھا تو ایک دوست مینڈک کا بچہ اُچھل کر اُس پر بیٹھ جاتا تھا اور اپنی بے خوف آنکھیں جھپکتا مجھے اُلفت سے تکتا تھا کہ ہم روزانہ کے ملاقاتی تھے.. یہ ملاقات چند لمحوں کی ہوتی.. میں ہتھیلی سے تختی کو مل مل کر.. چلو میں پانی بھر بھر کر تختی پر ڈالتا ملتا.. پچھلے روز کی لکھائی صاف کر کے اُس پر اعلیٰ درجے کی چکنی گاچنی کا پوچا اس نفاست سے پھیرتا کہ تختی کی سطح پر میرے ہاتھ کی لکیریں بھی دکھائی نہ دیتیں۔ وہ اتنی ہموار اور نفیس ہو جاتی.. پھر اس گیلی گاچنی کے لیپ کو دھوپ میں رکھ کر سکھاتا.. یہ ایک نہایت تخلیقی جوہر تھا جو بہت کم بچوں کے بس میں ہوتا تھا.. جیسے ایک مصور تصویر بنانے سے پیشتر اپنے کینوس کو تیار کرتا ہے ویسے میں اپنی تختی تیار کرتا تھا.. تختی سوکھ جاتی تو میں پہلا بچہ ہوتا جو اپنے ٹاٹ سے اُٹھ کر ماسٹر راتھر کے سامنے اسے ایک فنی شاہکار کے طور پر پیش کر دیتا.. وہ سر ہلا کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے پھر اُس کی سادہ اور کوری سطح پر مدھم پُورنے ڈال دیتے.. پُورنے ہلکی اور مدھم سیاہی میں اُلیکے ہوئے وہ حرف ہوتے ہیں جن پر کلک پھیر کر انہیں واضح کرنا ہوتا ہے..

مجھے نالے کے گرد جو جنگلی سروٹ اُگے ہوئے تھے ان میں سے وہ کانے تلاش کر لینے میں بھی ملکہ حاصل تھا جن سے بہترین قسم کی قلمیں گھڑی جا سکتی ہیں.. یہ پتلی بانس نما کونپلیں ایسی ہوں کہ نہ اتنی کچی ہوں کہ گھڑتے ہوئے وہ موم کی مانند نرم ہوں اور نہ اتنی درشت اور پکی ہوں کہ گھڑنے والا چاقو کند ہو جائے.. اور وہ ہاتھ بھی تجربہ کار اور تخلیقی ہونا لازمی تھا جو قلم کو گھڑتے ہوئے چاقو سے اُسے ایسے تراشے کہ وہ نشیب میں اُتر کر یوں اُبھرے کہ بانس کے گودے میں اُتر کر صرف اُس کی ظاہری جِلد کو تراش دے.. اور پھر وہ لمحہ کمال کا جب اس جِلد میں چاقو کی دھار سے

ایک ضرب لگا کر.. اس میں ایک لکیر کی خراش لگا کر ایک ایسی قلم وجود میں آئے جو روشنائی کو اپنے اندر اس خراش میں سنبھال سکے اور تختی پر منتقل کر سکے..

ماسٹر راتھر ایک ایسی ہی ضرب اور خراش لگا کر میری کِلک گھڑتے تھے اور میں اُس قلم سے مدھم پورنوں کو نمایاں کرنے کی سعی کرتا تھا.. انہیں واضح اور خوشنما کرنے کی از حد کوشش کرتا تھا لیکن ہمیشہ ناکام ہو جاتا تھا.. کہ میں ازل سے ایک بدخط شخص تھا.. پاپوش رقم تھا.. نفیس رقم نہ تھا..

لیکن اس کم عمری میں ہی مجھ پر کھل گیا تھا.. مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میری اپنی ذاتی کوئی حیثیت نہیں ہے.. پُورنے کوئی اور ڈالتا ہے اور میرا کام محض یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر قلم پھیر کر اسے واضح اور روشن کر دوں۔

میں محض ایک نقال تھا..

جو کچھ بھی لکھا جا چکا تھا اس پر میرا کوئی اختیار نہ تھا.. اُسے میں تبدیل کرنے پر قادر نہ تھا.. مجھے صرف اسی لیے پیدا کیا گیا تھا کہ لکھے لکھائے.. پہلے سے طے شدہ حرفوں پر قلم پھیرتا رہوں.. اور جو چاہے ہے سو آپ کرے ہے.. اور عبث ہمیں بدنام کیا.. بے شک میری تختی کی لیپا پوتی سب سے بڑھ کر ہے۔ میری کِلک کی تراش بے مثال ہے.. لیکن میرا کام صرف یہ ہے کہ لکھے لکھائے پر وہ کِلک پھیرتا چلا جاؤں..

''درست..'' میں نے سر جھکا.. محمد علی ڈاکیے کے سامنے.. بلکہ اس کے بدخشانی گھوڑے کی جلد کی لشکتی تھرتھراہٹ کے سامنے سر جھکا اور کہا ''جو کچھ میرے نصیب کی تختی پر پُورنوں کی صورت میں اُلیکا جا چکا ہے اس کا حتمی اور آخری ہونا اپنی جگہ لیکن.. تم مجھے یہ تو بتا سکتے ہو کہ تم کون ہو؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں کون ہوں؟''

''مجھے علم ہوتا کہ تم کون ہو تو میں تم سے دریافت کرتا کہ تم کون ہو؟''

''ہاں.. کیونکہ تمہیں یقین نہیں کہ میں وہی ہوں.. اس لیے تم پوچھتے ہو کہ میں کون ہوں..''

''میں بتاتا ہوں..'' بدخشانی گھوڑے کے نتھنے تھرکے ''یہ سوال میرے سوار سے کیوں پوچھتے ہو..'' گھوڑے کی جلد لشکتی تھی ''تم بتاؤ کہ کیا یہ میرے بس میں ہے کہ مجھ پر کون سوار ہوتا ہے.. ایک احمق یا دانا.. ایسے ہی یہ تمہارے بس میں بھی نہیں ہے کہ تم پر کون سوار ہوتا ہے..''

''لیکن میں تو گھوڑا نہیں ہوں..''

''تم ہو..''

''کیسے؟''

''ایسے کہ تمہارے پورنے لکھے جا چکے ہیں..تم پر تمہارا لکھا جا چکا نصیب سواری کرتا ہے.. باگیں اُس کے ہاتھ میں ہیں اور وہ انہیں اتنی قوت سے کھینچتا ہے تمہیں متعین کردہ راستے پر ہی رکھنے کے لیے کہ تمہارے نتھنے چرنے کو آتے ہیں..وہ تمہاری کمر میں ایڑیاں ٹھونکتا ہے کہ چلو..تو تم چل پڑتے ہو.. باگیں کھینچتا ہے تو تم اُنہی قدموں پر رُک جاتے ہو..ڈھیلی چھوڑتا ہے تو تم سر جھکا کر چلنے لگتے ہو..''

''تم خاموش نہیں ہو سکتے..''

''میں ہو جاتا ہوں..کیوں خاموش کرنا چاہتے ہو مجھے؟''

''تا کہ میں تمہارے سوار سے پوچھ سکوں کہ وہ کون ہے..''

''ہم دونوں کا..میرا اور تمہارا سوار ایک ہی ہے..''

''پھر بھی پوچھنا چاہتا ہوں..''

''پوچھ لو...''

''تم کون ہو؟''

''میں محمد علی ڈاکیا ہوں سر..'' گھوڑا پس منظر میں چلا گیا اور سوار بولنے لگا ''اُدھر دریا کنارے گلیشیر کے دہانے پر چند چولہے ہیں وہاں ڈاک دینے جا رہا ہوں..آخری دو کلومیٹر مجھے گھوڑا کام نہ دے گا..اسے ایک جل چکے چنار کے سیاہ تنے سے باندھ کر پیدل اوپر جاؤں گا اور اُس بستی کے لوگوں کو..جس میں آٹھ چولہے ہیں اُنہیں ان کے نام کے خط پہنچاؤں گا..''

بدخشانی گھوڑا جو تھوڑی دیر پہلے پس منظر میں چلا گیا تھا پھر نمایاں ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ اُس کی پشت پر دو چرمی تھیلے جھولتے ہیں..اُن میں سے ایک تھیلے کا فلیپ اُلٹ کر اُس نے کچھ خط نکالے اور مجھے دکھائے ''یہ خط صاحب..'' وہ اُنہیں اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا..

''محمد علی..کیا ان میں میرے نام کا کوئی خط بھی ہے..''

اُس نے بے دھیانی میں نظر اٹھائی ''آپ کا نام کیا ہے صاحب؟''

میں نے بتایا..

اُس نے اُن چند خطوط کو باری باری نہایت غور سے دیکھا..ان پر لکھے ناموں کو پڑھا۔

آگے پیچھے کیا اور پھر سر ہلا کر نادم سا ہوا اور سادگی سے مسکرانے لگا ''صاحب کیا بات کرتے ہو.. اِدھر آپ کے نام کا کوئی خط کیسے ہوسکتا ہے۔''

ہاں.. یہ ممکنات میں نہ تھا..

وہاں میرے نام کا کوئی بھی خط کیسے ہوسکتا تھا..

کہاں؟...

وہاں بام دنیا کے ایک پہاڑوں میں پوشیدہ شہر.. تبت خورد کی بستی سکردو سے آگے.. وادیٔ شگر اور خوبانیوں کے سورجوں سے لدے ہوئے ایک شجر سے آگے.. ایک پرشور برفانی نالے کے پار.. کہیں بلند پہاڑوں کی ویرانیوں میں یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ بدخشانی گھوڑے پر سوار سامنے سے یکدم نمودار ہونے والے ایک ڈاکیے کے پاس کوئی ایک خط میرے نام کا بھی ہو..

یہ تو صرف اُس ڈاکیے کی سادگی تھی جو میرے پوچھنے پر نہایت سنجیدگی سے ہر لفافے پر پوسٹ کارڈ پر میرا نام تلاش کرتی تھی اور پھر فوراً ہی یہ سادگی ندامت میں بدل گئی تھی..

اور یہی.. وہ لمحہ تھا.. جب ڈاکیا محمد علی لفافے اور پوسٹ کارڈ نہایت انہماک سے اُلٹتا تھا.. میرے نام کا خط تلاش کرتا تھا.. جس نے آئندہ برسوں میں مجھے چین سے سونے نہ دیا.. اگر اُس لمحے وہ اُن میں سے کسی ایک خط پر ٹھہر جاتا.. بے یقینی سے اُسے کچھ دیر تکتا اور پھر سر اُٹھا کر کہتا ''ہاں صاحب.. آپ کے نام کا ایک خط ــــ ہے!''

تو پھر کیا ہوتا..

میرا ردِّعمل کیا ہوتا..

یہ تو نہیں ہوسکتا تھا کہ اس دنیا میں کوئی ایک ایسا شخص ہو.. ایسی ہستی ہو.. بے شک غیب کا علم رکھنے والی ہستی ہو.. پھر بھی اُسے معلوم ہو جائے کہ میں اپنے شہر سے نکل کر سینکڑوں کلومیٹر دور کسی نا آشنا وادی کے درمیان.. فلاں دن.. فلاں وقت.. دو بج کر اکیس منٹ اور چالیس سیکنڈ پر.. ایک برفانی نالہ پار کر کے.. وہاں موجود ہوں گا اور وہ یہ پتہ.. لمحۂ وقت نوٹ کر کے مجھے ایک خط روانہ کر دے.. سامنے سے آنے والے محمد علی ڈاکیے کے چرمی بیگ کے لیے..

بے شک غیب کا علم رکھتا ہو.. لیکن اتنا باضابطہ.. باقاعدہ اور صحیح تو نہیں ہوسکتا.. کہ یہ خط فلاں دن.. فلاں وقت.. سورجوں سے آرائش شدہ ایک شجر کے آگے ایک نالے کے پار یہ خط مکتوب الیہ تک پہنچے.. اور وہ اس لمحے پہنچ جائے..

یہ ہو تو نہیں سکتا تھا..

لیکن اگر یہ ہو جاتا..

محمد علی ڈاکیا ایک خط الگ کر کے میری جانب بڑھاتے ہوئے کہہ دیتا کہ صاحب آپ کے نام کا ایک خط ہے..

تو وہ خط کس کا ہو سکتا تھا..

اگر وہ محض ایک ڈاکیا ہی تھا..

کوئی اور نہ تھا..

کچھ اور نہ تھا..

تو پھر وہ خط کس کا ہوتا؟

میں ابھی تک ایک ان جلی دیا سلائی ہوں...

مجھے اپنے آپ جل جانے پر کوئی اختیار نہیں.. مجھے کوئی جلائے تو جلتی ہوں.. بہت سے لوگ.. روزمرہ کے معمول کے مطابق.. اپنی ضرورت کے تابع مجھے جلاتے ہیں.. کبھی آتش دان کی لکڑیوں کو سلگانے کے لیے.. کبھی ایک سگریٹ کے لیے.. اور کبھی بلخ کے کسی متروک آتش کدے میں مقدس آگ روشن کرنے کے لیے!

اور کچھ لوگ.. لاکھوں میں سے دو چار لوگ مجھے جلاتے ہیں خودسوزی کے لیے..

مجھے بھی بالآخر جس مقصد کے لیے جلایا گیا وہ خودسوزی کی ہی ایک قسم ہے جسے بازاری لوگ ''محبت'' کہتے ہیں۔

میں نے کب جلنا تھا.. کس مقصد کے تابع جلنا تھا اس پر تو میرا کوئی اختیار نہ تھا.. کوئی بس نہ تھا..

میں تو ابھی ڈبیا میں تقریباً باون اَن جلی دیا سلائیوں کے ہمراہ قید میں تھی.. ہم میں سے کسی کو بھی کچھ پتہ نہ تھا کہ کب اس ڈبیا کے اندر ٹٹولتی ہوئی اُنگلیاں آئیں.. ہم میں سے.. ہم باون میں سے.. کسی ایک سے چھو جائیں اور اُسے نکال کر ڈبیا کے پہلو سے رگڑ کر جلا دیں.. چونکہ میں بھی یونہی.. انجانی اُنگلیوں کی گرفت میں آ کر.. جل اُٹھی تھی اس لیے یہ سرگزشت بھی میری ہے..

چونکہ جلی میں تھی اس لیے بیان بھی میں ہی کر رہی ہوں..

ایک مرغولے کی مانند اٹھتی گھومتی سیڑھیاں ہیں جن پر کچھ قدم ہیں جو اُتر رہے ہیں..

ہم باون ہیں اَن جلی دیا سلائیاں اور سیڑھیوں کی تعداد بھی باون ہے.. اور رات ہے..

سیڑھیوں کا اکلوتا بلب فیوز ہو چکا ہے.. قدم نابینا ہیں اور دیکھ نہیں سکتے.. اندازے سے

اٹک اٹک کر گھومتے آہستہ آہستہ احتیاط کے ساتھ اُترتے جاتے ہیں..

ایک ہیجان میں مبتلا بدن کے پسینے کی مہک ہے جو تاریکی میں گوندھی جا رہی ہے..اور یہی مہک اُس کی موجودگی کا پتہ دے رہی ہے..

تب ڈبیا کے بند تابوت کو کوئی سرکاتا ہے جس میں باون اَن جلی دیا سلائیاں لیٹی ہوئی ہیں..ایک دوسرے کے ساتھ جُڑی ہوئی ہیں اور اُن میں سے ایک میں بھی ہوں..ہم سب دم روک لیتی ہیں کہ جانے کس کی اجل آئی ہے..ٹٹولتی ہوئی اُنگلیاں مجھ پر ٹھہر جاتی ہیں' مجھے گرفت میں لیتی ہیں اور ڈبیا سے باہر نکالتی ہیں..باہر اندھیرے میں ایک مہک ہے جو میرے مساموں میں اُتر جاتی ہے..اُنگلیاں میرا ان جلا مُنہ ڈبیا کے پہلو سے رگڑتی ہیں تو میں فوراً جل اُٹھتی ہوں..

جل اُٹھتی ہوں تو اندھیرے میں دفن ایک چہرہ مڑتا ہے اور اُسے دیکھتا ہے جس کی اُنگلیوں میں میرا جلتا ہوا وجود ہے..

بس یہی خودسوزی کے آغاز کا وہ لمحہ ہے جسے بازاری لوگ ''محبت'' کہتے ہیں..

میں زیادہ دیر تک نہیں جلی لیکن اتنی دیر ضرور جلی کہ خودسوزی کی پہلی بھڑک کا باعث بن گئی..

پیچھے مڑ کر دیکھنے والا چہرہ سیڑھیوں کے اندھیرے میں یکدم رونما ہونے والے ایک مختصر شعلے کی روشنی میں ایک ناآسودہ اور بنجر شخص کے چہرے کو دیکھتا ہے اور اُس لمحے وہ انسان سے جانور میں بدل جاتا ہے..کہ انسان حساب کتاب..حواس اور منطق کا نام ہے اور جو کچھ اُس ایک مختصر شعلے کے بھڑکنے اور بجھنے کے درمیان ایک چُٹکی بھر ساعت میں ہوا وہ صرف ایک جانور کی خصلت ہی ہو سکتی ہے..جیسے جنگل میں کہیں ایک ٹہنی ٹوٹنے سے جانور کی تمام تر حسیات چوکنی ہو جاتی ہیں..ایسے میرے روشن ہوتے ہی اور اُس چہرے کے پلٹ کر دیکھتے ہی..ایک فی الفور موت میں تاریک ہو جانے والے شعلے کی مختصر مدت کی روشنی میں نظر آنے والے ناآسودہ اور بنجر شخص کو مڑ کر دیکھنے والے چہرے نے اُس ایک ساعت میں اپنے آپ کو فنا کر لیا۔آئندہ برسوں کے لیے' آئندہ صدیوں کے لیے..

اور یہ تبدیلی یک طرفہ نہ تھی..

بنجر شخص نے مڑتے ہوئے چہرے پر وہ سارے موسم دیکھے جن کی غیر موجودگی نے اُس کی زندگی کو بنجر کر دیا تھا..خودسوزی کی پہلی چنگاریاں اُس کی آنکھوں میں بھی بھڑکنے لگیں..

کسی بھی محبت کا آغاز اس سے مختصر وقفے میں کہاں ہوا ہوگا.. کہیں بھی نہیں۔

بنجر شخص کبھی ہرا بھرا تھا..

اُسے اعتماد تھا کہ ایک شخص بیک وقت مختلف رشتے برابری کی بنیاد پر نبھا سکتا ہے.. صرف اس کے لیے نیت کی شفافی درکار ہے اور وہ اس آئیڈیل کی تکمیل کے لیے جُت گیا.. لیکن اس کا نتیجہ بے حد غیر متوقع نکلا.. نیت کی درستگی انصاف کے پلڑوں کو برابر رکھنے میں شدید طور پر ناکام ہوگئی.. یہ کھلا کہ آپ صرف ایک قبیلے کے وفادار رہ سکتے ہیں.. تمام قبائل کے ساتھ محبت اور دیانت کی ایک ہی سطح پر قیام کرنا ممکن نہ تھا.. چنانچہ اسے ہر قبیلے نے دھتکار دیا.. کوئی ایک بھی درِ نیم وا نہ تھا سب کے سب مضبوطی سے بند تھے اور وہ کب تک سر پٹختا.. بے چارگی اور بے توجہی نے اُسے ایک ایسے بھیگے ہوئے بے گھر اور لاچار پلّے کی مانند کر دیا جو گندی نالی میں پڑا چاؤں چاؤں کرتا رہتا ہے اور کوئی بھی اُس پر ترس نہیں کھاتا..

ایک بھیگا ہوا بے گھر پلّا جب اندھیری سیڑھیوں میں یکدم روشنی کی ایک لپک میں مڑتا ہوا ایک چہرہ دیکھتا ہے تو وہ اگرچہ اُس کے جمال سے ششدر رہ جاتا ہے لیکن اُس ایک چہرے میں وہ اپنی تمام تر محرومیاں بھی دیکھتا ہے اور نا آسودگی مزید ایک گہری جھیل ہو جاتی ہے..

پلٹتے چہرے میں بھی ایک ٹھٹک ہے.. اسے بھی پتہ نہ تھا کہ صرف مڑ کر دیکھنے سے اس کی ساری حیات کا تانا بانا اُلجھ جائے گا.. اس کی زندگی کے کھیس کا ہر دھاگا بے سمت ہو جائے گا.. ایک معمول کے رنگوں اور خاکے والے.. ایک خاص نقشے والے کھیس کی بجائے.. جو کہ ہر چہرے کے نصیب میں ہوتا ہے.. ایک سراسر مختلف رنگ صرف اُس کے پلٹنے سے وجود میں ایجاد ہو جائیں گے... اس کے تن بدن میں ایسے خاکے اور نقش جنم لیں گے جو اس مختصر لمحے کی بھڑک کے نتیجے میں ظاہر ہوں گے..

اُسے.. اُس چہرے کو اگر یہ گمان بھی ہوتا تو شاید وہ پلٹ کر نہ دیکھتا.. کیوں دیکھتا.. اگر دیکھتا تو اپنی آئندہ حیات کی مسلسل شکست وریخت کو یقیناً دیکھتا.. تو پھر کیوں دیکھتا؟

لیکن جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا..

اُس چہرے کی حیات کا کھیس بھڑک کے ایک لمحے میں ہمیشہ کے لیے.. اگرچہ سب سے جدا.. بُنا گیا..

کھیس کی بناوٹ پر نہ اُسے.. اور نہ اسے جو اسے دیکھتا تھا.. کوئی اختیار رہا.. آئندہ